پروفیسر رشید احمد

سرسیّد کے سیاسی افکار

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے ساتھ ہی سلطنتِ مغلیہ مصائب و آلام کا شکار ہوگئی۔ ملکی اور غیر ملکی طاقتیں اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے سرگرم عمل نظر آنے لگیں۔ پچاس برس ہی کا عرصہ گزرا تھا کہ پلاسی کی جنگ نے ہندی مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور وہ طوقِ غلامی کے مستحق قرار دیئے گئے۔ تاجروں کو تاجداری کا شرف حاصل ہوگیا یہ کالے کوسوں سے آئی ہوئی تجارت پیشہ قوم سرزمینِ بنگال سے آگے بڑھی اور پچاس سال کے اندر ہی اس نے دہلی پر بھی اپنا قبضہ جمالیا۔ دوسری طرف شمالی ہند میں سکھوں نے اٹھارویں صدی کے آخر میں دو سال کے اندر پنجاب میں اپنے قدم جمالئے۔ سندھ، کشمیر اور سرحدی علاقے بھی ان کی ہوس ملک گیری اور ستم رانی کے شکار ہوگئے۔ مغل شہنشاہ کی سلطنت سکڑتے سکڑتے لال قلعہ کی چار دیواری کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ اس کی حیثیت ایک وظیفہ خوار سے زیادہ نہ رہی۔ ان سیاسی حالات کا اثر مسلمانوں پر شدید تھا۔ وہ اقتصادی اور مذہبی اعتبار سے پستی کے بدترین درجہ پر جا پہنچے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی اولاد نے حالات کا رُخ موڑنے کی انتہائی کوشش کی۔ بالآخر بالاکوٹ کی سرزمین کو لالہ زار بنا کر مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان شہداء کا خون اکارت نہیں گیا اس کے ذریعہ مسلمانانِ ہند میں جذبۂ جہاد پیدا ہوگیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی صورت میں اس جذبہ کا عملی ظہور ہوا۔ یارانِ وطن کی عیاری نے اس جنگ کو کامیابی کا منہ دیکھنے نہ دیا۔ تمام ذمہ داری مسلمانوں کے سر تھوپ دی گئی۔ دوسرے تو دامن جھاڑ کر اس سے الگ ہوگئے۔ سینکڑوں مسلمان خاندان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس زمانے میں مسلمان ہونا ہی سب سے بڑا جرم تھا۔ برائے نام مغل حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں کی خوشحالی اقتدار اور جاگیردارانہ نظام سے وابستہ تھی۔ جائدادوں اور جاگیروں کے چھن جانے اور اقتدار کے ہاتھ سے نکل جانے کے باعث وہ اقتصادی بدحالی کا بھی شکار ہوگئے۔ واضح وعدوں کے باوجود انگریزی کو فارسی کی جگہ دیدی گئی۔ سرکاری ملازمت کے لیے انگریزی دانی شرطِ اوّلیں قرار پائی۔ مسلمان جو صدیوں سے حکومت کرتے چلے آرہے تھے انگریزی پڑھ کر ذہنی طور پر غلام بننے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ دوسری طرف برادرانِ وطن نے نئی حکومت کے ساتھ بڑا تعاون کیا اور وہ اس کی انتظامی مشینری کے کل پُرزے بن گئے۔ دفاتر میں دو چار مسلمان نظر آتے بھی تو وہ صرف چپراسی ہوتے۔ یہ تو سب کچھ تھا ہی انگریزی اقتدار کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں نے بھی اپنی تبلیغ و اشاعت کی رفتار تیز تر کر دی۔ انہوں نے اسلام کو بدنام کرنے کی غرض سے اسلام اور بانیٔ اسلام پر طرح طرح کے بہتان باندھے۔ صحابۂ کرامؓ کی شان میں

بھی گستاخیاں کی گئیں۔ جس سے ان کا مقصد اہلِ ہند کو اسلام سے متنفر بنانا اور دنیا کی نظروں میں اس مقدس مذہب کو ذلیل و خوار کرنا تھا۔ علماء جو قدیم علوم کے ماہر تھے ان جدید حملوں کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔

ان حالات میں ایسے شخص کی ضرورت تھی جو "بستیز" سے زیادہ "بساز" پر ایمان رکھتا ہو کیونکہ بالاکوٹ اور ۱۸۵۷ء کے تلخ واقعات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نئے حاکموں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ نئے حکمران مسلمانوں سے انتہائی بدظن تھے۔ "غدر" کی ذمہ داری بھی ان پر عائد کی جاتی تھی اور پھر مسلمانوں کے عدم تعاون کے رویہ نے ان کی بدگمانی میں اضافہ کر دیا تھا۔ عیسائی مبلغین کا طرزِ عمل دوسری طرف مسلمانوں کو یہ باور کرنے پر مجبور کر رہا تھا کہ انہیں عزت و اقتدار سے تو ہاتھ دھونا پڑا ہی ہے ان کا مذہب بھی ان انگریز دل سے محفوظ نہ رہے گا۔ اس بدگمانی کے دور کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی ساکھ دوبارہ قائم کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ قدرت نے ان کاموں کی انجام دہی کے لیے سید احمد خاں کو منتخب کیا۔ جنہوں نے اس سلسلے میں محیر العقول کامیابی حاصل کی۔

حالاتِ زندگی

سید احمد ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ۳۳ واسطوں سے امام حسینؓ تک پہنچ جاتا ہے۔ دھیالی اور ننھیالی خاندان کے افراد حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ دادا محتسب اور قاضی لشکر تھے نانا ہزاری منصب رکھتے تھے، مغلوں کی طرف سے انہیں بڑے بڑے خطابات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ نانا انگریزوں اور مغلوں کے دربار میں اعلیٰ عہدے رکھتے تھے اور اکبر ثانی کے وزیر اعظم بھی رہے۔ سید احمد کے والد میر متقی گو شرفاء بزرگ تھے اس لیے تعلیم والدہ کے زیر سایہ حاصل کی۔ اس طرح سید احمد کو انتظام و تدبر کے ساتھ ساتھ علم و فضل اور زہد و تقویٰ بھی ورثے میں ملے تھے۔ پھر ننھیالی خاندان ولی اللہؒ کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کا حلقہ بگوش تھا اور والد مظہر جان جاناں کے جانشین شاہ غلام علی کے معتقد تھے۔ ان کا نام احمد بھی شاہ صاحب کا تجویز کردہ تھا۔ اس طرح ولی کے دونوں مذہبی مراکز سے سرسید قریبی تعلق رکھتے تھے۔

سید احمد کی تعلیم کی ابتدا قرآن مجید سے ہوئی۔ فارسی کتب کے مطالعہ سے فارغ ہو کر انہوں نے عربی کتابیں پڑھیں۔ مروجہ علوم میں ریاضی اور طب میں بھی دستگاہ حاصل کی۔ حصولِ علم کا سلسلہ دورانِ ملازمت میں بھی جاری رہا۔ بائیس سال کی عمر میں کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں وہ صوبجاتِ متحدہ کے مختلف ضلعوں میں رہے۔ ۱۸۵۷ء کے خونریز واقعات کے زمانے میں وہ بجنور میں تھے۔ انہوں نے باغیوں میں محصور انگریزوں کی جان بچائی۔ بجنور کے ہندو اور مسلمانوں نے فسادات کے دوران سید احمد کو اپنے ضلع کا ناظم مقرر کیا۔ ساٹھ سال کی عمر میں پنشن لیکر علی گڑھ آ گئے۔ انہوں نے ملازمت کا آغاز ایک سررشتہ دار کی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ جلد ہی ترقی کر کے منصف بنا دیئے گئے۔ وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی رہے۔ پبلک سروس کمیشن میں بھی وہ شامل تھے۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب بھی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے

انہیں ملا تھا۔ اور سرسید کے نام سے انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔

سرسید نے بے شمار کارنامے انجام دیئے۔ ان کی گرانمایہ تصانیف ان کے علمی اور ادبی کارناموں پر گواہ ہیں۔ ملازمت کی پابندیوں کے باوجود آثار الصنادید جیسی کتاب بھی تصنیف کی۔ اردو زبان اور ادب کی بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ علمی کارناموں میں زیادہ اہم یہ ہیں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، تعلیمی اور اصلاحی مقصد کے لیے انگلستان کا سفر، مسلمانوں کی بیداری کی غرض سے تہذیب الاخلاق کا اجرا اور ان سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کمیٹی کا قیام۔ جس نے پانچ سال کی تگ و دو کے بعد ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول قائم کر دیا اور اس کے دو ہی سال کے بعد اس کو کالج تک پہنچا دیا۔ ان کی ایک اور خدمت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تشکیل ہے جس کا مقصد ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے مسلم باشندوں کی تعلیمی حالت کرنا تھا۔ سرسید کی خدمات صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھیں انہوں نے کونسل کے ممبر کی حیثیت سے پورے ملک کے مفاد کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔

سرسید نے اسّی سال کی عمر میں ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڈھ میں وفات پائی۔

تصانیف

سرسید نے اوائل عمر ہی میں تصنیف و تالیف کا آغاز کر دیا تھا۔ شروع میں انہوں نے مختلف موضوعات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے۔ ان میں کچھ تو مذہبی امور سے متعلق ہیں اور دوسرے خالص علمی اور فنی ہیں۔ ان کی سب سے پہلی اور باقاعدہ کتاب آثار الصنادید ہے جس میں دہلی کی عمارات کا تفصیلی ذکر ہے اور ہم عصر مشاہیر کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ان مشاہیر میں علماء و صوفیا کے علاوہ ارباب علم و فن بھی شامل ہیں۔ "تاریخ بجنور" اور "تاریخ سرکشی بجنور" بھی سید کے تصنیف کردہ رسالے ہیں۔ سرسید کی سیاسی تصانیف میں اہم ترین تصنیف "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" ہے۔ جو سیاسیات پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اسباب سے بحث کی گئی ہے لیکن ضمناً سرسید کے سیاسی افکار پر بھی کماحقہٗ روشنی پڑتی ہے۔

سرسید کی مذہبی تصانیف میں بھی جا بجا ان کے سیاسی نظریات ملتے ہیں۔ مذہبی کتابوں کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اسلام کی نئے زاویوں سے توجیہہ و تفسیر کی جائے اور بدلے ہوئے حالات میں مذہبی فکر کی تشکیل عمل میں لائی جائے۔ ان کتب میں "تفسیر احمدی" جو تکمیل تک تو نہ پہنچ سکی، بڑی اہم ہے۔ جس میں سیاسی، تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی افکار پیش کیے گئے ہیں۔ قرآن کریم کے علاوہ انہوں نے بائبل کی بھی تفسیر لکھی ہے جس کا نام "تبیین الکلام" ہے۔ اس کتاب میں تمام تر کوشش اس بات پر صرف کی گئی ہے کہ بائبل اور قرآنی احکامات میں مطابقت کی راہ تلاش کی جائے۔ مذہبی تصانیف میں "خطباتِ احمدیہ" بھی ہے جس کا بالواسطہ تعلق سیاسیات سے ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سر ولیم میور نے نازیبا اعتراضات کیے تھے۔ قیام لندن کے دوران انہوں نے ان اعتراضات کے

کے جواب میں خطبات لکھے جن میں بدلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ اعتراضات نہایت لغو اور پوچ ہیں اور مذہبی تعصب پر مبنی ہیں ۔ جہاد اور غلامی خصوصیت کے ساتھ زیر بحث آئے ہیں اور اس سلسلے میں صحیح اسلامی احکامات کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

اسلوب بیان اور طرز استدلال

سر سید کی اہم ترین خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اردو نثر کو مسجع اور مقفیٰ طرزِ تحریر سے پاک کیا۔ قدما کی طرح اپنے خیالات کو محض لفاظی کے ذریعہ چھپانے کی کوشش نہیں کی ۔ دوراز کار تشبیہات اور بے محل قوافی کے ذریعہ سر سید نے عبارت آرائی سے کام نہیں لیا ۔ ان کی نثر کو تصنع سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ۔ ان کی طرز کو جو شرف قبولیت حاصل ہوا اس کی وجہ غالباً ان کا خلوص تھا جو انہیں اپنے مفید اور کار آمد خیالات کو سیدھے سادھے الفاظ میں قوم تک پہنچانے پر آمادہ کرتا تھا اور چونکہ وہ اپنے خیالات کی بنا ٹھوس دلائل پر رکھتے ہیں اس لیے ان کی تحریر عقل کو متاثر کرتی ہے ۔ اور دیرپا اثر دماغ پر چھوڑتی ہے اس میں جذباتیت اور خطیبانہ جوش و خروش نہیں پایا جاتا ۔ اس لیے اس میں حرارت کے مقابلے میں روشنی زیادہ محسوس ہوتی ہے ۔

سادگی اور بے ساختگی ۔ کے علاوہ سید صاحب کی تحریر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ قواعد کے بندھے ٹکے اصولوں کی پابندی نہیں کرتے ۔ وہ صحتِ کلام پر بے ساختگی کو ترجیح دیتے ہیں ۔ اسی طرز نے ان کی باتوں میں بلا کی تاثیر پیدا کر دی ہے ۔

سر سید بڑی جامع اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے ۔ اور مذہب، سیاست، تعلیم، اخلاق، معاشرت غرضیکہ کوئی میدان ایسا نہیں ہے جس میں انہوں نے فکر و عمل کے نقوش نہ چھوڑے ہوں ۔ ان کی تحریروں کا میدان عدالتوں کے فیصلوں اور جلسوں کی روئدادوں سے لے کر علمی، فنی اور اخلاقی مضامین تک پھیلا ہوا ہے ۔ اس کے باوجود ہر تحریر میں موقع کی مناسبت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کے الفاظ نقل کرنا زیادہ مناسب ہوگا ۔

" اگر علمی اور تاریخی مضامین میں دریا کے بہاؤ کی سی روانی ہے تو مذہبی اور پولیٹیکل تحریروں میں چڑھاؤ کی تیراکی کا ساز و رہے ۔ اعتراضات کے جواب میں متانت اور سنجیدگی ہے تو بے دلیل دعووں کے مقابلے میں ظرافت اور خوش طبعی ۔ نصیحت نشتر سے زیادہ دل خراش اور مرہم سے زیادہ تسکین بخش ہے ۔ غصہ مہربانی سے زیادہ پُر لطف ہے اور نفریں آفرین سے زیادہ خوش آیند ۔ وہی ایک قلم ہے جو اخلاق کے بیان میں ایک مورلسٹ کے ہاتھ میں معلوم ہوتی ہے تو عدالت کے فیصلوں میں ایک کہنہ مشق جج کے ہاتھ میں اور سالانہ رپورٹوں اور جلسوں کی روئدادوں میں ایک تجربہ کار سکریٹری کے ہاتھ میں ۔"

مختصراً یہ کہ سر سید کے اسلوب بیان میں سادگی، بے تکلفی دلکشی اور تنوع ہر پڑھنے والے کے دل کو مسحور کر لیتے

ہیں اور ان تمام خصوصیات کا کسی ایک مصنف میں جمع ہونا دشوار ہے۔

سرسید کے طرز استدلال کے متعلق ایک مرتبہ پھر مولانا حالی کے زریں الفاظ کو دہرانا ہوگا جن میں ان کے دلائل کی پختگی کو نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"سرسید کی بعض پولیٹکل اور اکثر مذہبی تحریریں ایسی ہیں جن میں انہوں نے ایک جماعت کثیر یا جمہور اہل اسلام سے اختلاف کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کو اپنے دعویٰ کے اثبات میں خلاف توقع اکثر ایسی کامیابی ہوئی ہے جیسی کہ ایک مسلم الثبوت رائے کی تائید کرنے والے کو ہونی چاہیئے۔ اسباب بغاوت ہند میں جو کچھ انہوں نے لکھا وہ تمام اینگلو انڈینز بلکہ شاید تمام انگلش نیشن کی رائے کے برخلاف تھا اور اسی لیے اس کا مارشل لا کے دور دورہ میں شائع کرنا خطرناک خیال کیا جاتا تھا۔ باوجود اس کے جس دھڑلے سے اس کا بہت بڑا حصہ منوایا گیا اور جو کام اس نے اعیان سلطنت کے غیض وغضب کی آگ بجھانے میں کیا اور جو عمدہ نتائج اس پر مترتب ہوئے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس قدر مدلل اور موجہ لکھا گیا تھا، اور اس میں کیسے صحیح اصول پر استدلال کیا گیا تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا ریویو ایک ایسے خیال کی غلطی ثابت کرنے کے لیے لکھا گیا تھا جو عموماً مدبران سلطنت کے دل میں جما ہوا تھا اور جس کو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب نے اور بھی پختہ کر دیا تھا۔ لیکن اس ریویو کے شائع ہونے سے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا اس خیال کی غلطی علی العموم سب پر ظاہر ہو گئی۔ جس وقت سرسید نے غلامی کے مسئلہ پر جمہور اہل اسلام کے خلاف رسالہ لکھنے کا ارادہ کیا تو مولوی سید مہدی علی خاں نے ان سے کہا کہ تم اس باب میں ایک حرف بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایسا نہیں لکھ سکتے جو اصول اسلام کے موافق صحیح ہو۔ لیکن جب انہوں نے سرسید کا ابطال غلامی کا مضمون تہذیب الاخلاق میں اول سے آخر تک پڑھا تو ان کو ماننا پڑا کہ اسلام نے فی الواقع ہمیشہ کے لیے غلامی کا استیصال کر دیا ہے۔"

سید صاحب مذہبی علوم سے مکمل واقفیت بلکہ اس کا گہرا مطالعہ رکھنے کے باعث اپنے افکار کی وضاحت میں بالعموم قرآن وحدیث سے ثبوت دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تفسیر آیات کے سلسلہ میں جمہور علماء نے شدید اختلاف کیا ہے لیکن جو لوگ کہ کسی خاص گروہ سے غیر متعلق ہو کر اور اپنے ذہن کو تعصب اور جانب داری سے محفوظ رکھ کر سید صاحب کی بیان کردہ تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں ان کی رائے کی صحت کا اقرار کرنا ہی پڑتا ہے۔ مثلاً ان کا دعویٰ ہے کہ غلامی از روئے اسلام ممنوع ہے وہ اپنے دعویٰ کی دلیل میں قرآن مجید کی یہ آیت پیش کرتے ہیں فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتیٰ اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا واما فداء۔ اس سے وہ ثبوت دیتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ آئندہ کسی کو غلام نہ بنایا جائے۔ اسی طرح ابطال غلامی کے لیے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتے ہیں کلکم عبید اللہ وکل نساءکم اماء اللہ (تم سب خدا کے غلام اور تمہاری عورتیں خدا کی کنیزیں ہیں)

اس لیے اگر غلامی جائز سمجھی جائے تو خدا کی خدائی میں دوسروں کی شرکت بھی لازم آتی ہے۔

سرسید پہلے مسلم مفکر ہیں جنھوں نے قدیم آسمانی کتابوں اور بانیانِ مذہب کے اقوال سے بھی استدلال کیا ہے مثلاً وہ حضرت عیسیٰؑ کے قول کے ذریعہ فاتح اور مفتوح اقوام میں محبت اور اخوت کے رشتے کی ضرورت واضح کرتے ہیں "جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ویسا ہی تم بھی ان سے کرو۔"

اس کے علاوہ وہ اپنے نظریات کے اثبات میں تاریخی شواہد سے بھی مدد لیتے ہیں۔ جن میں قدیم اور ہم عصر دونوں واقعات ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ فوج پر مکمل قابو رکھنے کے لیے مختلف قوموں کی جداگانہ افواج تیار کرنی چاہیئے چنانچہ کی مثال دیتے ہیں کہ وہ ایرانی اور افغانی دو فوجیں رکھتا تھا اور سرکشی کی صورت میں ایک کے خلاف دوسرے سے مدد لی جاتی تھی۔ سرسید نہ صرف مسلمانوں کی تاریخ بلکہ غیر مسلم اور غیر اشیائی اقوام کی تاریخوں کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔

سرسید اگرچہ خود کو "نیم چڑھا وہابی" کہتے ہیں تاہم وہ فقہا (جن کی تقلید کے وہ شدید مخالف ہیں) کے اقوال سے استدلال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مثلاً وہ خطابہ میں کسی بادشاہ کے نام کے لیے جانے کو ضروری نہیں سمجھتے تو ثبوت میں درمختار اور بحرالرائق کے مصنفین کی رائیں پیش کرتے ہیں۔

اپنے خیالات کو ذہن نشین کرانے نیز قاری پر اُن کی صحت ثابت کرنے کے لیے وہ جا بجا ایسے اشعار بھی پیش کرتے ہیں جن کی حیثیت ضرب الامثال کی سی ہو گئی ہے۔ ان میں سے اکثر اشعار سعدی شیرازی کے ہوتے ہیں۔ مثلاً سلطنت میں رعایا کی اہمیت سمجھانے کے لیے وہ سعدی کے مشہور شعر کا حوالہ دیتے ہیں کہ

رعیت چوں بیخ است و سلطاں درخت درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

وہ صرف فارسی اشعار ہی نہیں بلکہ عربی شعر سے بھی استدلال کرتے ہیں چنانچہ حکومت کے لیے تالیف رعایا کو ضروری بتلا کر کہتے ہیں کہ بے عزتی آدمی کے دل کو دکھاتی ہے اور اس کا ایسا گہرا زخم ہوتا ہے کہ کبھی نہیں بھرتا پھر یہ شعر نقل کرتے ہیں

جراحات السنان لها التیام ولا یلتام ما جرح اللسان

سرسید نہایت موزوں مثالوں سے نہ صرف اپنے خیالات کی وضاحت کا کام لیتے ہیں بلکہ ان کی پیش کردہ مثالیں بڑی سے بڑی دلائل کی جگہ لے لیتی ہیں۔ مثلاً وہ انگریزوں اور ہندوستانی رعایا میں باہمی ربط کے فقدان کے شاکی ہیں اس کی تمام تر ذمہ داری حاکم قوم پر رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ہماری گورنمنٹ نے اپنے آپ کو آج تک ہندوستانیوں سے ایسا الگ اور ان میل رکھا ہے جیسے آگ اور سوکھی گھاس۔ ہماری گورنمنٹ اور ہندوستانی پتھر کے دو ٹکڑے ہیں سفید اور کالے کہ الگ الگ پہچانے جاتے ہیں اور پھر ان دونوں میں ایک فاصلہ ہے کہ دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے حالانکہ ہماری گورنمنٹ کو ہندوستان کی رعایا کے ساتھ ایسا ہونا چاہیئے جیسے ابری کا پتھر کہ باوجود دو رنگ کے ایک ہوتا ہے۔ سفید رنگ میں سیہ خال بہت خوب صورت معلوم ہوتے ہیں اور سیاہی سفیدی عجیب بہار دکھلاتی ہے۔"

سیاسی نظریات

جس طرح کہ بغداد پر ہلاکو کی تباہ کاریاں دور رس نتائج کی حامل ہیں جن کے اثرات افکار اور تصورات پر بھی پڑے بعینہٖ ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات نے بھی طرزِ فکر کو بہت حد تک بدل کر رکھ دیا۔ حقیقت پسندی نے عینیت پسندی کی جگہ لے لی۔ ہم جو فرق ماوردی اور ابن طقطقی میں محسوس کرتے ہیں بالکل اسی فرق کا احساس ہمیں شاہ ولی اللہ اور سرسید میں محسوس ہوتا ہے۔ سرسید کے سیاسی نظریات کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ان کے زمانے میں برائے نام مسلمانوں کی حکومت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی اور نہ صرف ایک غیر مسلم قوم نے ان سے اقتدار چھین لیا تھا بلکہ رنگ، نسل اور وطنیت کے لحاظ سے حاکم و محکوم میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ سرسید ان حقائق سے کسی طرح چشم پوشی نہ کر سکتے تھے اس لیے ان کی تمام تر کوشش اس امر پر صرف ہوئی ہے کہ اسلامی سیاسی تصورات کو جدید نظریات کے ساتھ مطابقت دیدی جائے۔ اور اسلامی قانونِ سیاست کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس میں اور یورپی طرزِ فکر میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

انسان

سرسید خیال کو تمام جانداروں کے افعال و حرکات کا محرک بتلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمام حیوانات بشمول انسان متحرک بالارادہ ہیں۔ اُن کی اِن حرکات کا مقصد جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت ہوتا ہے اور یہ منفعت و مضرت مادی اور غیر مادی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ انسان اور دیگر حیوانات کے خیالات میں فرق صرف اس قدر ہے کہ انسانی خیالات غیر محدود ہوتے ہیں اور دوسرے جانور ایک محدود قسم کے خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں کے خیالات میں مندرجہ ذیل فرق ہے:

۱۔ جانور انسان کے مقابلے میں تمام سامانِ آسائش سے بلیں ہو کر پیدا کیا گیا ہے۔ سرسید کہتے ہیں "تمام جانداروں کی خوراک ان کی سعی اور تدبیر کے بغیر پیدا ہوتی ہے۔ سرد ملک کے جانوروں کے لیے نہایت عمدہ پشمینہ کا گرم لباس ان کے بدنوں پر پیدا کیا ہے۔ پرندوں کے لیے مینہ سے بچنے کا بارانی کوٹ انہی کے بدنوں پر سیا ہے۔ گرم ملک کے جانوروں کے لیے اس آب و ہوا کی مناسبت سے ان کا جامہ قطع کیا ہے مگر انسان کے لیے کچھ نہیں کیا۔"

۲۔ حیوانات میں کارکردگی کا ملکہ فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ انہیں دنیا میں کسی کام کو کرنے کا طریقہ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شہد کی مکھی کو رس چوسنے کے لیے عمدہ قسم کے ماخذوں کی شناخت کوئی نہیں بتاتا اور نہ اپنے گھروں کو ایسی عمدہ تقسیم سے بنانا جس میں ایک بڑا مہندس بھی حیران ہو جائے، کوئی نہیں پڑھاتا۔ بیئے کو ایسا عمدہ اور محفوظ کاشانہ بنانا کوئی نہیں سکھاتا۔ لیکن انسان کو بغیر سیکھے کچھ بھی نہیں آتا۔"

۳۔ غیر محدود خیالات کے نتیجہ کے طور پر انسانی اعمال و افعال بھی غیر محدود ہیں اور برخلاف اس کے دیگر حیوانات کے محدود خیالات محدود افعال پیدا کرتے ہیں۔

اس طرح سرسید کی رائے میں قدرت نے حضرت انسان کے نحیف و نازک کندھوں پر گوناگوں ذمہ داریاں عائد کی ہیں اور پھر ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسان کو خود سعی و کوشش کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کیونکہ دیگر حیوانات کے مقابلے میں اسے درماندہ پیدا کیا گیا ہے اس لیے قدرت نے اس کمی کو پورا کرنے، اپنی مشکلات پر قابو پانے اور اپنے فرائض سے نمٹنے کے لیے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ سرسید عقل کی تعریف اس طرح کرتے ہیں "انسان میں ایک ودیعت الٰہی جس کو عقل انسانی یا عقل کلی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ہوتی ہے۔" اسی ودیعت کے ذریعہ انسان اپنے مشاہدات اور تجربات کی مدد سے کلی قواعد تیار کرتا ہے اور ان کلی قواعد سے جزئیات حاصل کرتا ہے۔ سرسید کا خیال ہے کہ آفرینش ہی کے وقت عقل کا زیور انسان کو پہنایا گیا تھا اور جب تک انسان انسان ہے اس نعمت سے کبھی محروم نہیں ہوگا۔ اس طرح سرسید محض عقلیت کے بجائے تجرباتی عقل کے قائل ہیں۔ بیکن، لاک اور مل کے خیالات سے بہت حد تک اتفاق کرتے ہیں اور ہر قسم کے علم کا ذریعہ اسی عقل کو قرار دیتے ہیں۔ سرسید کے یہاں عقل کی اہمیت اس قدر ہے کہ وحی و نبوت بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی اور عقل کی دست گیری کے بغیر کوئی روحانی کیفیت، کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔ اس طرح جو چیز عقل کی کسوٹی پر صحیح ثابت ہوگی اس کو سرسید اچھا کہتے ہیں اور جو چیز اس معیار کے مطابق نہ اترے اس کے خراب ہونے کا وہ حکم لگاتے ہیں۔

سرسید کے نزدیک انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ وہ خطبات میں تعدد ازدواج کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں "انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا۔ وہ عورت ہے۔"

سیاست اور مذہب

سرسید مذہب کو تو عقل سے جدا نہیں دیکھنا چاہتے لیکن سیاست اور مذہب میں ان کے نزدیک کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک مذہب، سیاست کی راہ میں ایک زبردست روڑا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دینی حکومتیں جو دینی اور دنیوی دونوں کاموں میں اپنے آپ کو ان احکام کا پابند اور مجبور سمجھتی ہیں جن کو انہوں نے مذہبی احکام تصور کر رکھا ہے ایسی حکومتیں بالعموم غیر مہذب ہوتی ہیں کیونکہ وہ قدما کے جادہ سے سرمو تجاوز کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتیں خواہ قدما کا رویہ مذہبی اعتبار سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ سرسید کہتے ہیں کہ ایسے لوگ نہایت تنگ نظر ہوتے ہیں اور معمولی معمولی جزئیات کے متعلق بھی مذہبی سند تلاش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ چند دلچسپ مثالیں بھی دیتے ہیں۔ خود ان کی زبانی سنیے "بریچ لوڈ بندوق کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔ سپاہیوں کو تنگ وچست وردی پہنانا درست ہے یا نہیں۔

جزیرۂ عرب میں ریل بنانا خلافِ مذہب ہے یا نہیں۔ یہاں تک کہ ریل میں سوار ہونے کی نسبت بھی مذہبی اجازت کے منتظر ہوتے ہیں۔ سرسید کی رائے میں "ایسا ملک اور ایسی قوم ہمیشہ تنزل کی حالت میں رہتی ہے۔ تہذیب و شائستگی کی ہوا بھی وہاں تک نہیں جاتی۔ کوئی مستحکم قانون اس کے ہاں نہیں ہوتا۔ کسی شخص کے حقوق محفوظ نہیں ہوتے۔ کوئی شخص مال سے پورا پورا تمتع حاصل نہیں کر سکتا نہ کبھی ملک میں امن ہوتا ہے۔" وہ ترکی کی مثال پیش کر کے اس کے آئے دن کے فسادات اور بدامنی کا ذکر کرتے ہیں اور تمام بدنظمی، لاقانونیت اور اقتصادی ابتری کی واحد وجہ اس غلط خیال کو بتلاتے ہیں "جس کے بموجب دینی اور دنیوی دونوں قسم کے کاموں کو مذہب نے شامل سمجھا ہے اور انتم اعلم بامور دنیاکم کے جملے کو چھوڑ دیا ہے۔" ان کا دعویٰ ہے کہ ترکی ہی پر کیا جن حکومتوں نے مذہب اور سیاست کو توام سمجھ رکھا ہے ان کا بھی ترکی جیسا حال ہے لیکن جن مسلمان حکومتوں نے سیاست کو مذہب سے الگ رکھا ہے ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ اور اسی مناسبت سے وہ ترقی کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مصر طیونس کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ سید خیر الدین وزیر طیونس کے بڑے مداح ہیں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ امور دنیوی سے احکام مذہبی کو کچھ تعلق نہیں۔ اسی طرح وہ خدیو مصر اسمٰعیل پاشا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جس نے لادینی طرز کی حکومت کی بنیاد رکھی۔

سرسید کے یہ خیالات ممکن ہے کہ ہمارے کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہوں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ انیسویں صدی میں اسلامی حکومتیں جاں بلب تھیں اور لادینی طرز کی حکومتوں نے ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ ملاؤں کو کاروبارِ مملکت میں بڑا دخل حاصل تھا جو اپنی قدامت پسندی کے باعث ہر قسم کی اصلاح کے شدید مخالف تھے۔ حتیٰ کہ تابڑ توڑ شکستوں کے باوجود فوج کو جدید اسلحاتِ جنگ سے مسلح کئے جانے کی مخالفت میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ان کے اس رویہ نے تمام تعلیم یافتہ اور روشن دماغ افراد کو مذہب سے بیزار بنا کر رکھ دیا۔ اس لیے اگر سرسید مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کے خواہاں ہیں تو ہمیں غم و غصہ کے اظہار کی بجائے اس ماحول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جس میں یہ نظریات پیش کئے گئے تھے اور جن سے مجبور ہو کر کمال اتاترک کو لادینی قسم کی حکومت قائم کرنی پڑی تھی۔ اور ادارۂ حکومت سے مذہب کو بیدخل کرنا پڑا تھا۔

خلافت

مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خلافت یا بین الاقوامی اسلامی حکومت ایک لایعنی چیز بن کر رہ جائے۔ خلافت کے نظریہ کے متعلق حالی نے سرسید کا ایک دلچسپ لطیفہ "حیاتِ جاوید" میں لکھا ہے کہ سید کا "ایک آرٹیکل تہذیب الاخلاق میں اس مضمون پر شائع ہوا تھا کہ اجماع جسے اکثر اہلِ سنت سمجھتے ہیں حجتِ شرعی نہیں ہے شیعوں میں سے ایک سید صاحب جو بنارس میں ملازم تھے اس آرٹیکل کو پڑھ کر خوشی خوشی ان سے ملنے آئے۔ پہلے ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سرسید سے اس آرٹیکل کا ذکر کر کے کہنے لگے "کیوں صاحب جب آپ کے نزدیک

اجماع حجت نہیں تو خلیفہ اوّل کی خلافت کیونکر ثابت ہو گی؟" سرسید نے کہا "حضرت! نہ ہو گی تو اُن کی نہ ہو گی میرا کیا بگڑے گا" وہ یہ سن کر اور بھی زیادہ خوش ہوئے اور سمجھے کہ کچھ پانی مرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے۔ "کیوں صاحب اس اختلاف کے وقت جب کہ کچھ خلیفہ اول کا ہونا چاہتے تھے اور کچھ جناب امیر کا، اگر آپ اس وقت ہوتے تو کس کے لیے کوشش کرتے؟" سرسید نے کہا "مجھے کیا غرض تھی کہ کسی کے لیے کوشش کرتا؟ مجھ سے تو جہاں تک ہو سکتا اپنی ہی خلافت کا ڈول ڈالتا اور سو بسوئے کامیاب ہوتا"۔ یہ سن کر ان کا جی چھوٹ گیا اور جوتیاں پہن کر گھر کا رستہ لیا۔

اس لطیفے کو لکھنے کے بعد حالی سرسید کے نظریۂ خلافت کے متعلق رقمطراز ہیں "بہ ظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت اس پیرایہ میں انہوں نے اپنی اصلی رائے مسئلہ خلافت کے متعلق ظاہر کی ہے۔ ان کے نزدیک جیسا کہ انہوں نے اپنی تحریرات میں جا بجا ظاہر کیا ہے کوئی شخص خاتم النبیین کے بعد من حیث النبوۃ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا تھا اور اس لیے وہ کسی کی خلافت ماننے یا نہ ماننے کو ضروریاتِ دین نہیں سمجھتے بلکہ خلافت کو محض دنیوی سلطنت کی ایک صورت جانتے تھے اور اسی بنا پر جو کچھ خلفا نے اپنے اپنے عہد میں کیا اس کا ذمہ دار اسلام کو نہیں ٹھیراتے تھے بلکہ انہیں کو اس کا جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے"۔

سرسید عثمانیوں کے دعوئ خلافت کو حق بجانب تو نہ سمجھتے تھے لیکن مسلمانوں کی ایک حکومت کی حیثیت سے ان کی ہمدردیاں عثمانی حکومت کے ساتھ تھیں وہ خود لکھتے ہیں "ہمارے نزدیک یہ بات کہ مسلمان سلطان کو ایک مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں اور اس لیے اس کی ہمدردی کرتے ایک لغو اور مہمل بات ہے بلکہ یہ ہمدردی ایک قدرتی طبعی بات ہے"۔ اسی ہمدردی کے تحت انہیں یہ اندیشہ کھائے ڈال رہا تھا کہ "ترکی نیم جان" نے بھی اگر دم توڑ دیا تو مسلمانوں کی حالت یورپ کے یہودیوں جیسی ہو جائے گی۔ وہ جب ترکی سلطان کا ذکر کرتے ہیں تو مسلمانوں کی فطری خیر خواہی کے باعث ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حضرت سلطان روم عبدالعزیز خاں خلد اللہ ملکہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آخری عباسی خلفاء کو دو امتیاز حاصل تھے ایک تو یہ کہ خطبات میں بر سرِ منبر ان کا نام لیا جاتا تھا اور ان کے حق میں دعائے خیر کی جاتی تھی اگرچہ اس دعا کو اثر سے ازلی دشمنی رہی) دوم وہ دوسرے سکوں پر ان کے نام کندہ ہوتے تھے۔ دوسرا اشرف بہت حد تک خود مختار حکومتوں نے ان سے چھین لیا تھا۔ البتہ خطبوں میں ضرور نام لیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں ترکی خلافت کا جو حال تھا اور یورپی طاقتوں کا اس "مردِ بیمار" کے ساتھ جو رویہ تھا اس کے پیشِ نظر یہ رسمی چیز دیگر ممالک کے مسلمانوں کے حق میں مضر ثابت ہو رہی تھی۔ سرسید جنہوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان غلط فہمی ختم کر کے عمدہ تعلقات قائم کرنے کے لیے بڑی عرق ریزی اور دماغ سوزی سے کام لیا وہ انگریزوں کے معتوب عثمانیوں یا ان کے مغلوب مغلوں کا نام خطبات میں لئے جانے کو کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ وہ کہتے ہیں "یہ خیال کہ کسی بادشاہ کا خطبہ میں نام لینا کسی مذہبی مسئلہ پر مبنی ہے اور مسلمانوں کو اس بادشاہ کے مذہب کی رو سے کوئی مذہبی اطاعت واجب ہے صحیح نہیں ہے"۔ وہ اس طریقے کو بدعت بتلاتے ہیں اور بدلائل ثابت کرتے ہیں کہ خلفائے راشدین (جن کے طرزِ عمل کو اُمت پر لازمی قرار نہیں دیتے) کے

عہد میں اس قسم کا دستور موجود نہ تھا۔ انہوں نے جلال الدین سیوطی کا قول نقل کیا ہے کہ پہلا فرمانروا جس کا نام خطبوں میں لیا گیا وہ امین ہے۔ وہ درمختار اور بحرالرائق جیسی فقہی کتابوں سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ طریقہ مذہب کی رو سے ثواب کا کام نہیں ہے بلکہ بدعت اور محدث ہے۔ تاہم سرسید کسی کا نام لیے بغیر عادل بادشاہ کے حق میں دعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں اللھم ایید المسلمین بالسلطان العادل۔ وہ کہتے ہیں جو بھی بادشاہ ہم پر عدل و انصاف سے حکومت کرے، ہمارے مذہبی شعائر میں دست اندازی نہ کرے، ہماری جان و مال کی حفاظت کرے، ہمارے حقوق ہم کو عطا کرے وہ اس دعا میں داخل ہے۔ سرسید کا کہنا ہے کہ اس قسم کی دعا درحقیقت کسی بادشاہ کے لیے نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ہے۔

حکومت کی قسمیں

سرسید حکومت کی دو قسمیں بتلاتے ہیں ایک کو وہ "مہذب" کہتے ہیں اور دوسری کو "نامہذب" کا نام دیتے ہیں۔ انہوں نے ملک، حکومت اور تہذیب میں گہرا تعلق محسوس کیا ہے کہ ایک دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ ملک حکومت پر اثر انداز ہوتا ہے اور حکومت خود ملک کی تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں "ملک جب نامہذب ہوتا ہے تو ضرور کچھ نہ کچھ گورنمنٹ میں نا تہذیبی آجاتی ہے اور جب گورنمنٹ مہذب ہوتی ہے تو کسی نہ کسی قدر تہذیب ملک میں ہوجاتی ہے۔" پھر باشندگانِ ملک کی تہذیب یا عدمِ تہذیب ہی کی بنا پر ملک کے مہذب یا غیر مہذب ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔

سرسید کے نزدیک مہذب حکومت کی شرائط یہ ہیں اول یہ کہ ملک میں حکومت کے فرائض کی انجام دہی کے لیے قوانین جاری ہوں اور ان قوانین کی اہم ترین خصوصیت یہ ہو ان کی رو سے تمام رعایا کے حقوق مساوی ہوں۔ کوئی شخص حتیٰ کہ خود گورنمنٹ بھی ان قوانین سے بالاتر نہ سمجھی جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ محض قوانین کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ ان قوانین کے نفاذ کے لیے کافی قوت موجود ہو جسے وہ گورنمنٹ کہتے ہیں۔ جس حکومت میں یہ خصوصیات پائی جائیں گی وہ مہذب حکومت کہلائے گی اور جو ان چیزوں سے محروم ہوگی اسے ہم غیر مہذب اور نا تربیت یافتہ ملک کہیں گے۔ سرسید غیر مہذب حکومت کے نقائص بیان کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کرتے ان کی رائے میں ایسی حکومت میں کبھی امن نہیں رہتا، ملک کی، مال کی، دولت کی، قوم کی، رعایا کی کبھی ترقی نہیں ہوتی۔

جمہوریت

سرسید آزادیٔ رائے کو بہت اہمیت دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک عمدہ حکومت وہ ہے جس کے متعلق عوام نہایت آزادی اور بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آزادیٔ رائے ایک ایسی چیز ہے کہ ہر ایک انسان اس کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ وہ ہر اس شخص کو خواہ وہ ایک اور تنہا ہو، جو اکثریت کے فیصلوں سے اتفاق

نہیں کرتا۔ اظہار رائے کا اتنا ہی موقع دیا جانا ضروری سمجھتے ہیں جتنا کہ اکثریت کو حاصل ہے۔ ان کے نزدیک تعداد کے پیش نظر کسی رائے کے حسن و قبح پر حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔ وہ آزادیٔ رائے کے عنوان سے ایک مضمون میں لکھتے ہیں، "رائے کی غلطی آدمیوں کی تعداد کی کمی و بیشی پر منحصر نہیں ہے بلکہ قوتِ استدلال پر منحصر ہے جیسے کہ یہ بات ممکن ہے کہ نو آدمیوں کی رائے بمقابلہ ایک شخص کے صحیح ہو ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے بمقابلہ نو کے صحیح ہو۔"

سرسید دینی اور دنیاوی معاملات میں اظہار رائے کی آزادی کو نہایت مفید سمجھتے ہیں اور اس کا فائدہ یہ بتلاتے ہیں کہ مخالف اور موافق رایوں کے معلوم ہو جانے سے دونوں قسم کی آراء پر جدا جدا غور کرنے کا موقع ملتا ہے اور ان کے متعلق اس فیصلے پر پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے کہ ان دونوں میں سے صحیح کون ہے۔ سرسید اس بات کے معترف ہیں کہ

"ہر زمانے میں انسانوں کا یہی حال رہا ہے کہ سو میں سے ایک ہی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ کسی دقیق معاملے میں رائے دے اور ننانوے شخص اس میں رائے دینے کی لیاقت نہیں رکھتے۔" اس طرح سے غالباً اس ایک آدمی کے سپرد کاروبارِ مملکت کر دینا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسے مخالف رایوں کے سننے اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کی وہ تاکید کرتے ہوئے کہتے ہیں "ہر ایک شخص کو اس کی رائے کیسی ہی زبردست اور مضبوط ہو اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضامندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ اس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بے باکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا تو وہ ایک مردہ اور مردار رائے قرار دی جاوے گی نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت۔"

سرسید کا یہ عقیدہ ہے کہ جن تجاویز کے سلسلے میں عوام کو اظہار رائے کی آزادی نہیں ہوتی خواہ یہ پابندی حکومت کی طرف سے عائد کی گئی ہو یا رعایا نے خود اپنے اوپر لگا لی ہو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ تجاویز دلوں پر اثر نہیں کرتیں اور لوگ اس کو اہمیت بھی نہیں دیتے۔

انہوں نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اظہار رائے کی آزادی کے لیے کیا کیا چیزیں مانع ہیں۔ ان کے نزدیک اس کا ایک سبب رسم و رواج ہے جس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار آسان کام نہیں۔ دوسرا اس سے بھی بڑا سبب مذہبی عقائد اور خیالات ہیں جس کے خلاف بات کرنا ہلاکت کا موجب ہے۔ ان کے خیال میں اظہار رائے کے لیے تیسرا مزاحم مصلحتِ عامہ ہے یعنی حکومت کسی رائے یا مسئلہ یا عقیدے کی سچائی اور صحت سے بحث کرنے کے لیے اس لیے منع کرتی ہے کہ رائے فی نفسہٖ کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن اس پر عام لوگوں کا پابند رہنا نہایت مفید اور فلاح عام کا باعث ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ظالم حکومتیں اپنے مظالم کی وجہ سے لوگوں کی آزادیٔ رائے پر پابندی عائد کر دیتی ہیں۔ لیکن کبھی نیک اور تربیت یافتہ حکومت میں بھی رعایا اس خیال سے اپنی رائے ظاہر نہیں کرتی

کہ ان کے مباحثے اور دلیلوں کو اس رائے میں کوئی دخل حاصل نہیں ہے یا ان کی رائے کی طرف کون التفات کرنے والا نہیں ہے۔ سرسید کا خیال ہے کہ اکثر ایسا ہوا ہے "رعایا نے کبھی اپنے وہمی خوف یا ارکین سلطنت کی بدمزاجی کے ڈر سے یا ان کے خلاف رائے کے کوئی بات نہ کہنا مصلحتِ وقت سمجھ کر یہ خیال کر کے کہ گورنمنٹ کے یا کسی کے برخلاف بحث کرنا خیر خواہی نہیں مباحثہ ترک کر دیا۔"

سید صاحب حکومت میں رعایا کی مداخلت کو حکومت کی خوبی اور پائداری کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حکام کو اپنی تدبیر کے حسن و قبح کا علم عوام کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر عوام کی رائے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو حالات بہت نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں حتیٰ کہ ان کا علاج بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ غیر ملکی حکومت کے لیے بالخصوص ضروری بتلاتے ہیں کہ وہ رعایا کی عادات اور اطوار سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان کے نمائندوں سے صلاح و مشورہ کرتی رہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ رعایا کے اوضاع اور اطوار بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی روشنی میں قوانین مترتب ہونے چاہئیں تاکہ سلطنت کو پائداری نصیب ہو۔ سرسید کہتے ہیں کہ اگر ان اوضاع و اطوار کو حکومت کے قوانین کے تحت لانے کی کوشش کی گئی تو رعایا بددل ہو جائے گی اور اس کے نتائج بہت مہلک ثابت ہوں گے۔

سلف گورنمنٹ کے فوائد کا سرسید نے اپنی تحریر و تقریر میں ذکر کیا ہے۔ کونسل میں انہوں نے سلف گورنمنٹ کے بل پر بحث کے دوران کہا "میں اس بات کے خیال سے خوش ہوں کہ اس قدر عرصہ تک زندہ رہا کہ میں نے اس دن کا آغاز دیکھ لیا جبکہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سلف ہیلپ اور سلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنھوں نے انگلستان میں REPRESENTATIVE INSTITUTIONS (نمائندہ ادارے) پیدا کئے ہیں اور اس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔" وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس نمائندگی کا طریقہ ہر ملک میں ایک جیسا نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ملک کے علاقائی حالات اور سیاسی اور سماجی کیفیات کے مدنظر نمائندگی کے اصول متعین کئے جانے چاہئیں۔ وہ انگلستان کے طرزِ حکومت کے بڑے مداح ہیں۔ بایں ہمہ ان اصولوں کو بجنسہٖ ہندوستان میں رائج کر دیئے جانے کے وہ حامی نہیں ہیں کیونکہ برِکبیر پاک و ہند کی وسعت، اس کا طول و عرض، آب و ہوا کے اختلافات، مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگوں کی آبادی اور اپنے اپنے مذہبی معاملات میں ہر ایک کا کٹرپن، ذات پات کی قید اور سماجی لحاظ سے مختلف گروہوں کے باہمی امتیازات کے پیش نظر ہندوستان میں عام جمہوری اصول کے نفاذ میں جو مشکلات تھیں ان سے سید صاحب بے خبر نہیں ہیں۔ لکھنؤ میں منعقدہ ایجوکیشنل کانفرنس کے تاریخی اجلاس میں سرسید نے کہا "ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں ذات پات کے اختلاف اب تک موجود ہیں، جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی، مجھ کو کامل یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الکشن کے خالص اور سادہ

اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی ..... بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آوے گی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کے جاری کرنے کا جوابدہ سمجھیں گے جن کے باعث سے قوم و مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے۔"

انہیں حالات کے پیش نظر انہوں نے کونسل کے اجلاس میں مساوی نمایندگی کی شدید مخالفت کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ "ہندوستانیوں کو ایسے حقوق دینے جن سے ہندوستان کی تمام معزز قومیں برابر مستفید نہ ہو سکیں کسی طرح مناسب نہیں ہے۔" سرسید ہندوؤں کی خود غرضی اور سیاسی چالوں سے خوب باخبر تھے ۔۔۔ ۱۸۵۷ء کے فسادات کے دوران ہندوؤں کے رویے کو دیکھ کر ان کی دوررس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ سیاسی پلیٹ فارم پر ہندو اور مسلمانوں کا اشتراک عمل مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت نہ ہوگا وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

حکومت اور حکمران

سرسید کا دعویٰ ہے کہ "حقیقی بادشاہت خدا تعالیٰ کو سزاوار ہے جس نے تمام عالم کو پیدا کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حقیقی سلطنت کا نمونہ دنیا میں بادشاہوں کو پیدا کیا ہے تاکہ اس کے بندے اس نمونے سے اپنے حقیقی بادشاہ کو پہچان کر اس کا شکر ادا کریں۔" اس تصور کے تحت سرسید بادشاہ میں بہت اعلیٰ صفات کے دیکھنے کے خواہاں ہیں جن سے خدا کی ذات متصف ہے۔ فی الحقیقت ظل اللہ فی الارض کی سرسید نے نادر توضیح کی ہے۔ ان سے پہلے اس کا مفہوم صرف یہ تھا کہ رعایا پر اطاعت سلطان فرض ہے۔ جو شخص سلطان کی اطاعت کرے گا گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو سلطان کی نافرمانی کرے گا وہ اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ لیکن سرسید کے نزدیک ظل اللہ فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ بادشاہ کو صفات الٰہیہ سے متصف ہونا چاہیئے۔ وہ رسالۂ بغاوت میں رقمطراز ہیں "بڑے بڑے حکیموں اور عقلمندوں نے یہ بات ٹھہرائی ہے کہ جیسا کہ اس حقیقی بادشاہ کی خصلتیں داد و دہش اور بخشش اور مہربانی کی ہیں اسی کا نمونہ ان مجازی بادشاہوں میں بھی چاہیئے۔ یہی بات ہے کہ جس کے سبب بڑے بڑے عقلمندوں نے بادشاہ کو ظل اللہ ٹھہرایا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس طرح خداوند تعالیٰ کی بے انتہا بخشش اپنے تمام بندوں کے ساتھ ہے اسی طرح بادشاہوں کی بخشش اور انعام اپنی ساری رعیت کے ساتھ چاہیئے۔"

سرسید بادشاہ کی صفات میں داد و دہش اور جود و سخا کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فیاضی کا فائدہ خود بادشاہ کو پہنچتا ہے۔ رعایا کے دل میں بادشاہ کی محبت متمکن ہو جاتی ہے کیونکہ الانسان عبید الاحسان ہے۔ یہی نہیں سلطان کی محبت کے باعث رعایا کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور خدمت گزاری اور خیر خواہی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں جن کے ذریعے مشکل سے مشکل امور آسانی کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ سرسید کے نزدیک یہ خیال کہ فیاضی کی

وجہ سے خزانہ خالی ہوجاتا ہے انتہائی لغو ہے ان کا دعویٰ ہے کہ "اگلی عملداریوں میں یہ بات بہت رائج تھی ہر ہر طرح سے انعام واکرام رعایا کو اور سرداروں کو ملتا تھا۔ بڑے بڑے قیمتی خلعت اور عمدہ عمدہ تحفے اور نقد روپیہ اور زمین جاگیر انعام میں ملتی تھی۔ خاندانی آدمی خطاب پاتے تھے ہم چشموں میں عزت پیدا کرتے تھے۔ ان کے دل میں بڑے بڑے حوصلے آتے تھے۔"

قیاضی کے علاوہ بادشاہ میں دوسری صفت حلم ہونی چاہیئے۔ وہ حلم کی اہمیت واضح کرنے کے لیے یسوع مقدس کا قول نقل کرتے ہیں "مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں اس لیے کہ زمین کے وارث ہوں گے۔"

سرسید کے نزدیک بادشاہ میں تواضع اور خاکساری کا ہونا بھی ضروری ہے لیکن اس طرح کہ رعب و دبدبہ پر حرف نہ آنے پائے وہ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ غرور و گھمنڈ کے ذریعہ شاہی وقار قائم نہیں ہوتا۔ وہ مسیح کا قول ایک بار پھر نقل کرتے ہیں "مبارک وہ ہیں جو دل میں بے غرور ہیں اس لیے آسمان کی بادشاہت ان ہی کی ہے۔" سرسید اگلے وقتوں کے بادشاہوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں "ہر ایک شخص مل کر ان کے اخلاق اور ان کی محبت کا فریفتہ ہوجاتا تھا اور تعجب سے کہتا تھا کہ یہ کیسے اچھے لوگ ہیں کہ باوجود اس حشمت و شوکت اور حکومت کے بے غرور ہیں اور کس طرح اخلاق سے ملتے ہیں۔"

بادشاہ کی صفات کے علاوہ سرسید نے اس کے فرائض سے بھی جابجا بحث کی ہے۔ وہ تہذیب الاخلاق میں "نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ" کے عنوان کے تحت گورنمنٹ کے فرائض اس طرح گنواتے ہیں "گورنمنٹ کا فرض ہے کہ جن لوگوں پر وہ حکومت کرتی ہے ان کے حقوق کی خواہ وہ حقوق مال و جائداد سے متعلق ہوں خواہ کسب و پیشہ و معاش سے، خواہ آزادیٔ مذہب آزادیٔ رائے اور آزادیٔ زندگی سے، ان کی محافظ ہو۔ غیر مساوی قوتوں سے کسی کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ کمزور مستحق کو غیر مستحق زور آور سے پناہ میں رکھے۔ ہر شخص اپنی ملکیت سے اپنے ہنر سے پورا پورا متمتع ہو۔" اس کے علاوہ رسالہ اسباب بغاوت ہند میں جہاں وہ انگریزوں کی عملداری کی خامیاں گنواتے کے ساتھ ان کی خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں ان سے ایک عمدہ حکومت کے فرائض کے متعلق ان کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک حکومت کا اولیں فرض یہ ہے کہ رعایا کے ساتھ محبت اور اتحاد کا رشتہ قائم کرے اور ان کی عزت اور احترام کا خاص خیال رکھے۔ قیام امن و امان اور رعایا کی آسائش کا انتظام بھی حکومت کا اہم فریضہ ہے۔ راستوں کی حفاظت، ڈاکوؤں اور رہزنوں کا قلع قمع کرنا راستوں کو آراستہ اور مسافروں کے آرام کے لیے اہتمام کرنا سب ایک اچھی حکومت کے فرائض میں داخل ہیں۔ ان کے علاوہ تاجر پیشہ لوگوں کے مال و متاع کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا بھی حکومت کا فرض ہے۔ خونریزی اور خانہ جنگی کا انسداد بھی حکومت پر واجب ہے۔

راعی اور رعایا کے تعلقات

سرسید راعی اور رعایا کے تعلقات کو بے حد خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں اور بادشاہ پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں

کہ اس کی حکومت کا انحصار رعایا کے دم قدم پر ہے۔ اس سلسلے میں وہ سعدی شیرازی کا مشہور شعر پیش کرتے ہیں:

رعیت چوں بیخ است وسلطاں درخت درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

اس لیے وہ اس بات کے خواہاں ہیں کہ دونوں کے تعلقات محبت اور رواداری پر قائم ہوں۔ وہ رسالۂ اسبابِ بغاوت میں محبت کی اہمیت بیان کرتے ہیں کہ "اس سے جنگلی وحشی جانور دام میں آتے ہیں اور درندے رام ہوتے ہیں۔" وہ کہتے ہیں کہ جب راعی اور رعایا کے تعلقات محبت اور دوستی پر قائم نہیں ہوئے ملک میں بدنظمی اور ابتری پھیل رہی۔ وہ ہندوستان میں ترکوں اور پٹھانوں کی حکومت کا ذکر کرتے ہیں جبکہ حاکم ومحکوم میں میل جول نہ تھا تو آسائش اور آسودگی سلطنت بھی میسر نہ تھی۔ اکبر سے لیکر شاہ جہاں تک باہمی میل ملاپ بڑھا تو "بے نظمی اصولِ سلطنت" کے باوجود اس برادرانہ محبت کی وجہ سے رعایا خوش رہی پھر عالمگیر کے زمانے میں سخت گیری کے باعث رعایا ناراض ہوگئی اور پھر آسائش عنقا بن گئی۔

سرسید اس معاملہ میں واضح خیالات رکھتے ہیں کہ راعی اور رعایا کے تعاون اور اتحادِ عمل کے بغیر خوش حالی اور قیامِ امن کی توقع رکھنا عبث ہے۔ وہ اتحاد اور محبت کے لیے مذہب وملت اور قوم ونسل کے اختلافات کو سدِ راہ نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں "ہم کو دن رات تجربہ ہوتا ہے کہ دو غیر ملک اور مختلف مذہب کے آدمیوں میں اتحاد ہوتا ہے اس صورت میں کہ وہ اتحاد کرنا چاہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دو ہم قوم اور ہم مذہب اور ہم وطن آدمیوں میں کمال دشمنی اور عداوت ہوتی ہے اس سے ثابت ہے کہ محبت اور اتحاد اور دوستی ہونے کو اتحاد مذہب اور ہم وطن اور ہم قوم ہونا ضروری نہیں۔"

اس عقدہ کو بھی سرسید کے گرہ کشا ناخنوں نے سلجھایا کہ قیامِ محبت میں پہل کس کی طرف سے ہونی چاہیئے اور فریقین میں سے کس پر اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ان کی رائے میں یہ حکومت کا فرض ہے کہ رعایا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ بڑے معقول دلائل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں "یہ بھی ایک عام قاعدہ محبت کا جبلتِ انسانی بلکہ حیوانی میں بھی قدرتی پیدا کیا گیا ہے کہ اعلیٰ کی طرف سے ادنیٰ کی طرف محبت چلتی ہے باپ کی محبت اپنے بیٹے کی طرف پہلے اس سے شروع ہوتی ہے کہ بیٹے کو باپ سے، اسی طرح مرد کی محبت اپنی عورت کی طرف عورت کی محبت سے جو مرد کی طرف ہے مقدم ہے۔ اسی بنا پر یہ بات ہے کہ ادنیٰ جو اعلیٰ سے محبت شروع کرے وہ خوشامد گنی جاتی ہے نہ محبت۔"

سرسید صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتے کہ حکومت کو رعایا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیئے بلکہ راعی اور رعایا کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے چند طریقے بھی تجویز کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ تالیف قلب کو موثر ترین ذریعہ کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ رعایا کو باعزت رکھنا اور ان کی تالیف قلب کرنا حکومت کی پائداری کا سب سے بڑا سبب ہے۔ انسان عزت کو دولت پر ترجیح دیتا ہے۔ اس لیے اگر اسے تھوڑا ملے لیکن عزت حاصل ہو تو وہ بہت زیادہ خوش ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ بہت ملے اور عزت نہ ہو۔ بے عزتی ایسی بد چیز ہے کہ آدمی کے دل کو دکھاتی ہے۔ یہی چیز ہے کہ بغیر ظاہری

نقصان پہنچانے عداوت پیدا کرتی ہے اور اس کا زخم ایسا گہرا ہوتا ہے کہ کبھی نہیں بھرتا ۔ پھر سرسید تالیف کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں " یہ وہ چیز ہے کہ اس سے دشمن دوست ہوتا ہے اور دوستوں کی محبت زیادہ ہوتی ہے ۔ بیگانہ یگانہ ہوتا ہے ۔ یہی چیز ہے جس سے وحشی جنگل کے جانور چرند پرند تابع ہوتے ہیں پھر اگر رعایا کے ساتھ ہو تو وہ کس قدر مطیع اور فرمانبردار ہوں گے ۔ "

تالیف کے علاوہ ایک اور طریقے سے حاکم و محکوم میں دوستانہ تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں وہ اس طرح کہ ان میں مساوات ہو اور کسی قسم کا امتیاز نہ برتا جائے ۔ وہ البرٹ بل جو ۱۸۸۳ء میں وائسریگل کونسل کے اجلاس میں پیش ہوا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو بھی اختیار دیا جائے کہ وہ یورپی باشندوں کے فوجداری مقدمات کا فیصلہ کر سکیں ۔ اس بل کی تائید میں سید نے بڑی مدلل تقریر کی اور کہا " تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی کی بربادی کرنے والی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ حاکم اور محکوم کے درمیان قومی تفرقہ قائم رکھا جائے ۔ . . . . مجھے یقین واثق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک کے عام قانون میں دخل ہوگا اس وقت تک دونوں قوموں کے درمیان اصل دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم رہیں گی ۔ زندگی کی بے وشل خوشی اور موافقت اور پولیٹکل ہمسری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے ۔ " سرسید کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کی پابندیاں بھی صدیوں تک صرف اس لیے قائم رہیں کہ زمانۂ قدیم کے مقننوں نے برہمن کے واسطے ایک قانون اور شودر کے واسطے دوسرا قانون بنایا ۔

سرسید جہاں رعایا کے حقوق کی تفصیل لکھتے ہیں وہاں ان کے فرائض کے بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے ۔ وہ تاکید کرتے ہیں کہ رعایا بادشاہ کی خیرخواہ اور وفادار رہے ۔ فرمانروا خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم بہرحال سرسید کے نزدیک اس کی اطاعت رعایا پر فرض ہے ۔ وہ کہتے ہیں اسلام میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کہ جس حکومت کے سایۂ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن اور آزادی حاصل ہو اس کی رعیت حکومت کی وفادار اور خیرخواہ نہ ہو ۔ اسی لیے ان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہباً یہ فرض ہے کہ اپنے بادشاہ جس کی وہ رعیت ہیں اور جس کی امان میں مذہبی آزادی سے وہ بسر کرتے ہیں ہمیشہ اس کے تابع رہیں ، گو وہ ترکوں کے ساتھ کیسی ہی ہمدردی رکھتے ہوں اور گو ترکی اور خود قسطنطنیہ میں کچھ ہی ہوا کرے ۔ سرسید یہاں تک کہہ دیتے ہیں " فرض کرو کہ خود انگلش گورنمنٹ بجائے روس کے ہوتی اور ترکوں کا ملک بظلم چھین لینا چاہتی اور گو اس بات سے کیسا ہی رنج و غم اور غصہ و آزردگی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہوتی اس پر مذہب کی رو سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان میں جہاں ان کو امن اور مذہبی آزادی ہے بجز انگریزی گورنمنٹ کی اطاعت کے اور کچھ چارہ کار نہیں ۔ "

سرسید رعایا کی طرف سے ایجی ٹیشن یا احتجاج کئے جانے کو بھی اطاعت کے منافی سمجھتے ہیں ۔ ان کی کانگریس کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ کانگریس نے احتجاج کو اپنا ہتھیار بنا لیا تھا ۔ اور گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کے لیے پچاس ہزار رسالے عوام میں تقسیم کرائے جن میں گورنمنٹ کے خلاف بہت مواد تھا ۔ سرسید نے بھی اسباب بغاوت شائع کیا تھا لیکن عوام

تک ایک بھی کاپی نہیں پہنچنے دی تھی۔ ان میں سے چند کاپیاں حکومتِ ہند اور باقی سب کی سب پارلیمنٹ میں بھیج دی تھیں۔

بغاوت

سر سید بغاوت کی تعریف بھی لکھتے ہیں اور اس چیز سے بھی بحث کرتے ہیں کہ رعایا کے دل میں بغاوت کا ارادہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک بغاوت کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل چیزیں داخل ہیں:

(۱) گورنمنٹ کا مقابلہ کرنا (۲) گورنمنٹ کے مخالفین کی امداد کرنا (۳) مخالفانہ ارادے سے حکم نہ ماننا اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنا (۴) نڈر ہو کر گورنمنٹ کے حقوق اور حدود کو توڑنا۔

اس طرح سر سید کے نزدیک بغاوت قانونی حکومت کی صرف مخالفت کا نام نہیں ہے بلکہ باغیوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ امداد بھی اس زمرے میں داخل ہے۔ اگر رعایا مخالفت کی نیت کے بغیر حکومت کے احکامات کی پابندی نہ کرے تو وہ بغاوت نہیں ہے البتہ مخالفانہ ارادے سے حکم عدولی بغاوت کی تعریف میں آجاتی ہے۔ وہ رعیت کے آپس میں ایسی جنگ و جدل کو بھی جس سے قانون شکنی ہو بغاوت کہتے ہیں۔ گورنمنٹ کی محبت اور خیر خواہی کا دل میں نہ ہونا اور مصیبت کے وقت حکومت کی امداد نہ کرنا بھی بغاوت کے مترادف ہے۔

اسبابِ بغاوت میں وہ اہم ترین سبب یہ بتلاتے ہیں کہ ایسا حکم نافذ کیا جائے جو رعایا کی طبیعت، طینت، ارادہ، عزم، رسم و رواج اور خصلت و جبلت کے خلاف ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ عام بغاوت کا سبب بھی عام ہوتا ہے جس سے تمام لوگ متاثر ہوتے ہیں اور جو سب کی طبیعتوں کے مخالف ہو۔ اگر ایک عام سبب نہ ہو تو چند خاص اسباب کا مجموعہ بھی بغاوت کا موجب بن جاتا ہے اس طرح کہ ایک ایک سبب ایک ایک طبقہ کے افراد کی برہمی اور ناراضگی کا باعث بنے۔ وہ ۱۸۵۷ء کی سرکشی کے عام طور پر بیان کردہ اسباب میں سے ایک ایک سبب کا جائزہ لیتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ یہ اسباب اس بدقسمت واقعہ کا حقیقی سبب نہ تھے۔ ان کے نزدیک نہ تو چپاتیوں کی تقسیم کسی سازش کا نتیجہ تھی اور نہ اس میں روس و ایران کا ہاتھ تھا۔ ایرانی شہزادے کے خیمے سے اشتہار کا برآمد ہونا بھی بغاوت کا محرک نہ تھا اور نہ ہی بہادر شاہ کا شاہ ایران کو خط لکھنا ان کی رائے میں فتنے کا موجب بنا اور اسی طرح نہ تو اودھ پر انگریزوں کے قبضے ہی کو بغاوت سے کوئی تعلق تھا اور جہاد کے فتوے کا بھی اس میں کوئی ہاتھ نہیں۔ ان کے نزدیک یہ تمام اسباب جو عام طور پر اسبابِ بغاوت سمجھے جاتے ہیں نہ تو تنہا اور نہ مل کر عام سرکشی پیدا کر سکتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس کا صرف ایک سبب تھا کہ ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں نہ شامل کر کے انہیں کاروبارِ مملکت سے دور رکھا گیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں "بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی مگر لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پس یہی ایک بات جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فسادات کی اور جتنی باتیں اور جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں" وہ اس امر سے بھی بحث کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں شریک نہ کرنے سے کیا مضر نتائج برآمد ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح

دہرا نقصان پہنچا۔ ایک طرف "اغراض عام رعایا جس کا لحاظ رکھنا گورنمنٹ کے واجبات میں تھا ملحوظ نہ رہیں اور رعایا کو اس مضرت کے رفع کرنے اور اپنے مطلب کو پیش کرنے کی فرصت اور قدرت نہ ملی"۔ اس سے بڑھ کر دوسرا نقصان یہ ہوا کہ "رعایا کو منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ گورنمنٹ کا معلوم نہ ہوا، گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی"۔ اور یہ غلط فہمی رفتہ رفتہ اس قدر شدید ہوگئی کہ رعایا حکومت کو "میٹھا زہر"، "شہد کی چھری" اور "ٹھنڈی آنچ" سمجھنے لگی۔ سر سید قانون سازی میں رعایا کو شامل کئے جانے کے اس قدر حامی ہیں کہ ان کے نزدیک آزادی پریس سے بھی وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو فی الحقیقت قانون ساز مجلس میں نمائندگی سے ہوتا ہے۔ اس کی راہ میں تمام مشکلات کو وہ ہیچ سمجھتے ہیں حتیٰ کہ رعایا کی عام جہالت کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ پھر انتخاب کے سلسلے میں جو عملی مشکلات پیش آئیں ان کی وجہ سے اس نمائندگی کو ہی ختم کر دینا ان کے نزدیک مناسب نہیں ہے بلکہ ان مشکلات پر قابو پانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ لیکن انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء کی رو سے سر سید جب وائسرائے کی کونسل کے ممبر بنے تو ان کی خوشی پر غم و اندوہ کے بادل چھائے ہوئے تھے کہ ہندوستانی اپنی جہالت اور علم کی روشنی سے محروم ہونے کے پیش نظر ان فرائض سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔

دربار

سر سید دربار عام کے انعقاد پر بہت زور دیتے ہیں اور اس کو راعی اور رعایا کے قریبی تعلقات پیدا کرنے کا عمدہ ذریعہ بتلاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے انگریزی حکومت کی بہت سی کوتاہیاں گنوائی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد کبھی دربار کے انعقاد کا اہتمام نہیں کیا۔ پہلی عملداریوں میں رعایا جب دربار میں حاضر ہوتی تو بادشاہ کا جلوہ دیکھ کر بے حد خوش ہوتی۔ وہ کہتے ہیں "ایک قاعدہ جبلتِ انسانی میں پڑا ہے کہ اپنے بادشاہ اور مالک سے مل کر دل خوش ہوتا ہے۔ یہ بات جانتا ہے کہ یہ ہمارا بادشاہ اور مالک ہے ہم اس کے تابع اور رعیت ہیں"۔ سید صاحب دربار کے ذریعہ جو حکمران کو فائدے پہنچتے ہیں اور رعایا کے حالات کا جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی طرف صریح اشارہ نہیں کرتے۔

عمالِ حکومت

سر سید کہتے ہیں کہ بادشاہ کے جملہ فرائض اور راعی اور رعایا کے باہمی تعلقات یعنی محبت، الفت، عزت اور تالیفِ رعایا سب کے سب حکام متعہد کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہیں کیونکہ یہی لوگ حکومت کی طرف سے کارپرداری اور رعایا سے معاملہ اور میل جول اور ملاقات رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ ارکانِ حکومت بڑی اہمیت کے مالک ہیں اور چونکہ حکومت کی تمام پالیسی ان ہی کے ذریعہ عملی جامہ پہنتی ہے اس لیے اچھے اور نیک لوگوں کے سپرد حکومت کے فرائض کئے جائیں۔ اس کی وجہ خود وہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "گورنمنٹ کا ارادہ کیسا ہی نیک ہو وہ کبھی ظاہر نہ ہوگا جب تک کہ یہ لوگ اس بات کے

ظاہر کرنے پر کمر نہ باندھیں"۔ پہلی اور بنیادی چیز جس کی سید صاحب عمالِ حکومت سے توقع رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ رعایا کی عزت و توقیر میں کسی قسم کی کسر اٹھا نہ رکھیں ان کی خاطر داری اور دلدہی کو اپنا فرضِ منصبی سمجھیں اور دوستانہ طور پر رعایا کے رنج و راحت میں شریک ہوں۔ سرسید کی رائے میں اراکینِ سلطنت کو اخلاقی اعتبار سے بہت بلند ہونا چاہیئے۔ ان میں غرور و نخوت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیئے اور اس کے باوجود وہ اپنے تحشم اور رعب و دبدبہ برقرار رکھیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے انگریز حکام کی جو قلمی تصویر پیش کی ہے اس کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں "ان کے غرور اور تکبر نے تمام ہندوستانیوں کو ان کی آنکھوں میں ناچیز کر دیا ہے"۔ وہ سوال کرتے ہیں "کیا ان کی بدمزاجی اور بے پروائی نے ہندوستانیوں کے دل میں بے جا دہشت نہیں ڈالی ہے۔ کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی احکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا۔ اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے کہ صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی اس نوکری سے گھاس کھودنی بہتر ہے"۔

اس کے علاوہ سرسید کے نزدیک عہدیداروں کے انتخاب کو کسی خاص قوم یا فرقے تک حصر کر دینا شدید غلطی ہے جیسا کہ کئی بار انہوں نے اپنی کونسل کی تقریروں میں واضح کیا ہے۔

محکمہ قضا

سرسید کا کہنا ہے کہ مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیے جو قوانین وضع کئے جائیں وہ نہایت مفصل اور واضح ہوں اسی لیے وہ بنگال اور آگرہ کے قانون کو پنجاب میں مروج قانون پر ترجیح دیتے ہیں اور وجہ یہ بتلاتے ہیں "قانون پنجاب کا ایک مجمل مطلب ہے ان ہی قوانین کا جو اس ملک میں جاری ہیں۔ ان کے بسط اور پھیلاؤ اور عمل کے واسطے قواعد مقرر نہیں ہیں۔ ہر حاکم اس میں خود مختار ہے۔ سب حاکموں کی رائے سلیم ہونی ضروری نہیں ہے"۔ اس طرح سید صاحب محکمۂ انصاف کی عمدہ کارکردگی کے لیے عمدہ قانون کا ہونا شرطِ اولیں سمجھتے ہیں۔ واضح قانون ہونے کے علاوہ اس کو "منصفانہ بے طرفدار اور بارحم ہونا چاہیئے"۔ سرسید کہتے ہیں کہ جو قانون بھی ان خوبیوں کا حامل ہو اور اس پر عملدرآمد بھی ٹھیک طور سے ہو تو پھر ججوں کے کسی قوم یا فرقے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے زیادہ فرق نہیں پیدا ہوگا۔

سرسید شعبہ ہائے عدالت میں دیوانی کو بہت زیادہ اہم بتلاتے ہیں اور اپنی اس رائے کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ دیوانی کا محکمہ سب محکموں سے زیادہ تر عمدہ ہے جس پر نہایت اہتمام چاہیئے۔ یہی محکمہ ہے جس پر آبادیٔ ملک اور اجرائے تجارت، افزونی بنج بیوپار اور استحکام حقوق منحصر ہیں"۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ اگر عدالتوں کا نظم و نسق خراب ہو، غیر واجبی انتقالات اور ناجائز قرضوں کی ڈگری کے ذریعہ لوگوں کو تباہ حال کر دیا جائے تو ملک کے طول و عرض میں فتنہ و فسادات کا پھیل جانا یقینی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدالتوں کی بدنظمی کے اثرات فوری طور پر محسوس نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں

دس سال کا زمانہ بھی اس کے لیے ناکافی ہے۔ نصف صدی کے بعد یہ بدنظمی رنگ لاتی ہے۔

عدالتوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے سرسید چند تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ اول یہ کہ انفصالِ مقدمات میں غیرضروری تاخیر نہ ہو۔ دوم یہ کہ انصاف کا حصول سہل اگر نہ ہو تو ارزاں ضرور ہو۔ اسی لیے وہ اسٹامپ کے طریقے کے جاری کئے جانے کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ہندوستانی عوام کے دن بدن بڑھتے ہوئے افلاس کے پیشِ نظر اسٹامپ کے بار کو ناقابلِ برداشت قرار دیتے ہیں۔ وہ دستاویزات پر اسٹامپ کے چسپاں کئے جانے کو "قابلِ الزام اور بے وجہ محض" کہتے ہیں۔ بالخصوص محکمۂ انصاف کے کاغذات پر اسٹامپ کی شرط عائد کئے جانے کو وہ بدترین محصول بتلاتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس سے نہ صرف مفلس رعایا زیر بار ہوتی ہے بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ طریقہ عدل گستری سے ہی باز رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب انگلینڈ جیسے تربیت یافتہ متمول، راست باز اور معاملہ فہم ملک میں اسٹامپ ڈیوٹی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مشہور ماہرینِ اقتصادیات نے اس کے نقصانات کی وضاحت میں کتابوں کی کتابیں لکھ ماری ہیں مثلاً مِل کی پولیٹکل اکونمی (Political Economy) اور لارڈ بروم کی پولیٹکل فلاسوفی (Political Philosophy) اسٹامپ کے مضر اثرات کے بیان سے پُر ہیں تو ہندوستانیوں پر اس کا کیا اثر ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ سرسید حکام دیوانی کے محدود اختیارات کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ جن کی وجہ سے انفصالِ مقدمہ میں ہرج واقع ہوتا ہے۔

سید صاحب تمام رعایا کے لیے بلاامتیازِ رنگ و نسل اور قوم و ملت کے ایک ہی عدالت رکھنا چاہتے ہیں۔ ابتداءً یہ طریقہ نافذ تھا کہ فوجداری کے مقدمات کے دونوں فریقوں کے ہندوستانی ہونے کی صورت میں ہندوستانی جج تصفیہ کیا کرتے تھے۔ لیکن اگر فریقین میں ایک یورپی باشندہ ہوتا تو فیصلہ ہندوستانی عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے باہر ہوتا تھا۔ سرسید نے البرٹ بل (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) پر بحث کے دوران ان خدشات کو لغو بتایا جن کے تحت فوجداری کے معاملات جن میں کوئی یورپی باشندہ بہ حیثیت ایک فریق کے ہوگا ہندوستانی جج کے روبرو پیش ہونے سے کوئی ناانصافی ہوگی کیونکہ دیوانی معاملات میں ایسے اختیارات دیئے جانے کے بعد کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ سرسید کہتے ہیں کہ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے طریقۂ کار اور اختیارات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک دیوانی عدالتوں کے فیصلے بھی کسی فرد کی قسمت کی کایا پلٹ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا "عدالت ہائے دیوانی کی ڈگریات ایک شخص کو دولت مند سے مفلس کر سکتی ہیں، دیوانی کے بعض صیغے صرف ذاتی ملکیت ہی سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ اس میں ذاتی گرفتاری کے اختیارات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اور انصاف کی غرض سے ان میں اس قسم کی کاروائی کی اجازت دی گئی ہے جو فوجداری کی عدالتوں کے واسطے قرار دی گئی۔ دیوانی کے مقدمات میں واقعات کی نسبت نتیجوں کے قرار دینے کا قاعدہ زیادہ نزدیکی ہے جیسا کہ فوجداری کے مقدمات میں ہوتا ہے۔" وہ دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں کے قانونِ شہادت

کی یکسانیت نیز فریقین کی عزت پر بٹا لگنے کے امکانات دیوانی اور فوجداری دونوں میں برابر دیکھتے ہیں۔ وہ عدالت کے نظم و نسق میں انتظامی مصلحت کو زیادہ دخل دیئے جانے کے قائل نہیں بلکہ ان کا کہنا ہے کہ آزادی، انصاف، اور انسانیت ہی کو محکمۂ انصاف کا مقصد اولیٰ ہونا چاہیئے۔

فوج

جس طرح گیارہویں صدی عیسوی کا مفکر کیکاؤس بن وشمگیر فوج میں بغاوت کے رجحانات کو ختم کرنے کے لیے بادشاہ کو مشورہ دیتا ہے کہ مختلف قوم اور نسل کے لوگ فوج میں بھرتی کئے جائیں سرسید بھی اسی قسم کے خیالات رکھتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ کیکاؤس ایک ہی فوج میں مختلف عناصر کی شمولیت کا خواہاں ہے اور سرسید مختلف قوموں کی جداگانہ پلٹنیں قائم کرانا چاہتے ہیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ کیکاؤس کے نظریہ میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ مختلف قومیت کے افراد کے ایک جگہ جمع ہونے سے ان میں تعاون اور اتحادِ عمل مفقود ہوگا جس سے فوج کی افادیت بُری طرح متاثر ہوگی لیکن سرسید کے پیش کردہ نظریہ میں یہ خامی رفع کر دی گئی ہے۔ کیکاؤس کا کہنا ہے کہ اس طرح سے بغاوت ہی نہ ہوگی لیکن بالفرض اگر فوج باغی ہو جائے تو اس کے سدباب کا کوئی طریقہ وہ تجویز نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے سرسید کہتے ہیں اگر فوج سرکشی پر بھی آمادہ ہو جائے تو دوسری فوج سے اس کی سرکوبی کرنی ممکن ہوگی۔ وہ اس سلسلے میں نادرشاہ کی مثال دیتے ہیں کہ اس نے ایران اور افغانستان کو فتح کرنے کے بعد دو فوجیں تیار کیں۔ ایک ایرانی قزلباشوں پر مشتمل تھی اور دوسری میں سب کے سب افغان تھے۔ جب ایرانی فوج سرتابی کرتی تو افغانی فوج اس کو سزا دینے کے لیے متعین کر دی جاتی اور جب افغان سرکشی کرتے تو اس کا تدارک ایرانی فوج کے ذریعہ کیا جاتا۔ سرسید نہایت واضح الفاظ میں متنبہ کرتے ہیں کہ ایک ہی فوج میں دو مختلف قوموں کے رکھنے سے یہ مقاصد حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ ایک ساتھ رہنے سہنے کے باعث ان میں اتحاد و ارتباط پیدا ہو جانے کی وجہ سے ایک کے ذریعہ دوسرے کی سرکوبی کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔ سرسید کی رائے میں ہندوستان میں انگریزوں نے بھی یہی غلطی کی جس کا انجام یہ ہوا کہ کارتوس کے معاملہ میں ہندو اور مسلمان دونوں متحد رہے۔

سرسید فوج میں غرور اور گھمنڈ کو بہت مضر بتلاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک ہی فوج کے ذریعہ متواتر فتوحات حاصل کرنے سے لازمی طور پر فوج میں خود بینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ تمام ملکی فتوحات اسی کی قوتِ بازو کی رہینِ منت ہے۔ جب یہ چیز فوج میں پیدا ہو جاتی ہے تو معمولی سے معمولی حکم میں حیل و حجت شروع کر دیتی ہے۔ سرسید کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں فوجی بغاوت کا ایک سبب یہ بھی تھا اور فوجی علانیہ یہ کہتے تھے کہ برما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا غرور انتہا کو پہنچ گیا تھا اور وہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر تکرار کرنے پر مستعد ہو جاتے تھے حتیٰ کہ کچھ عجب نہ تھا کہ فوج کوچ اور مقام پر بھی تکرار کرنے لگتی۔

فوج اور حکومت میں باہمی اتحاد ہونا ضروری ہے۔ سرسید اس کی اہمیت سے واقف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فوجی

بغاوت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ فوج کو اگر یہ احساس ہو جائے کہ حکومت ان پر اعتماد نہیں کرتی ہے تو وہ بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور عدم اعتماد یا بداعتمادی نتیجہ ہوتی ہے۔ فوجیوں پر بے جا سختی اور ناجائز سزاؤں کی وہ ۱۸۵۷ء کی فوجی بغاوت کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بارک پور کی پلٹن کو کارتوس کے کاٹنے سے انکار کرنے پر موقوف کر دیا گیا تھا۔ اس کا بُرا اثر پڑا۔ پھر میرٹھ کی فوج پر نامناسب سختی کی گئی اس نے اپنی وفاداریوں کا یہ صلہ دیکھ کر بغاوت کر دی۔

وہ اربابِ حکومت پر فوج کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں کہ ملک کے نظم و نسق کا انحصار فوج ہی پر ہے اور رعایا کے دل میں حکومت کا رعب اور خوف بھی فوج ہی کے بل بوتے پر قائم رہتا ہے۔ اس لیے جب فوج بغاوت کر دیتی ہے تو اس کا اثر عوام پر بھی پڑتا ہے۔ وہ حکومت کی طرف سے بالکل نڈر اور بے خوف ہو جاتے ہیں اور مفسدین اور فتنہ پردازوں کو سر اٹھانے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔

جہاد

سرسید کا دعویٰ ہے کہ جملہ قواعد خواہ وہ روحانی ہوں یا تمدنی، اخلاقی ہوں یا سیاسی ان کا قانونِ قدرت سے مطابق ہونا ضروری ہے۔ ورنہ وہ قابلِ عمل نہ ہوں گے۔ وہ عیسائیت اور بدھ مت کے نرم مزاج اور رحمدلانہ قوانین کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ قوانین کانوں کو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن کسی زمانے میں نہ تو اس پر عمل ہوا اور نہ ہی آئندہ کبھی ان پر عمل کئے جانے کی توقع ہے۔ اس لیے وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "کوئی قانون وہ ظاہر میں کیسا ہی چمکیلا اور خوش آیند ہو جب کہ وہ قانونِ قدرت کے برخلاف ہے تو محض نکما اور بے اثر ہے۔" اسلامی قوانین و احکام کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ "اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اس کے تمام قانون، قانونِ قدرت کے مطابق اور عملدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ رحم، جہاں تک قانونِ قدرت اجازت دیتا ہے، رحم ہے، معافی کی جگہ معافی ہے، بدلے کی جگہ بدلہ ہے، لڑائی کی جگہ لڑائی ہے، ملاپ کی جگہ ملاپ ہے اور یہی بڑی دلیل ہے اس کی سچائی کی اور قانونِ قدرت بنانے والے کی طرف سے ہونے کی۔" وہ کہتے ہیں کہ اسلام نہ تو ملک گیری اور فتوحاتِ ملکی حاصل کرنے کے لیے فوج کشی اور خونریزی کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی اشاعتِ اسلام کی غرض سے کسی زمین پر حملہ آور ہونا پسند کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاد کی اجازت صرف دو صورتوں میں دی گئی ہے۔ ایک اس وقت جب کہ کافر اسلام کی عداوت اور اسلام کو معدوم کرنے کی غرض سے نہ کہ کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں۔ کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائی ہوتی ہے خواہ وہ مسلمان مسلمان میں ہو یا مسلمان اور کافر میں سرسید کا اس کے متعلق فتویٰ یہ ہے کہ "وہ ایک دنیاوی چیز ہے اس کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاد کے جواز کی صورت یہ ہے کہ ملک یا قوم میں مسلمانوں کو صرف اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں ان کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائضِ مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو بشرطیکہ یہ مسلمان اس ملک میں بطور رعایا نہ رہتے ہوں کیونکہ رعایا ہونے کی صورت میں ان کے لیے وہی راہیں رہتی ہیں یا تو

ان کے مظالم کو برداشت کریں یا ہجرت کر جائیں۔ سرسید کا دعویٰ ہے کہ صرف تین قسم کے لوگوں سے جہاد کرنے کی اجازت قرآن کریم میں دی گئی ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ وہ لوگ جو خود مسلمانوں کے ساتھ جنگ کا آغاز کریں۔

۲۔ ایسے افراد جنہوں نے دغا کر کے معاہدوں کو توڑ دیا ہو۔

۳۔ ایسے ظالم جنہوں نے مسلمانوں کو یا ان کے بچوں اور عورتوں کو عذاب اور تکلیف میں ڈال رکھا ہو۔

اس تمام وضاحت کے بعد سرسید پوچھتے ہیں "کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی جنگ ناانصافی اور زیادتی ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی اخلاق کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ لڑائی قانونِ قدرت اور انسان کی فطرت کے مخالف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس لڑائی کا حکم خدا کی مرضی کے برخلاف ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس حالت میں بھی لڑائی کا حکم نہ ہوتا بلکہ دوسرا گال پھیر دینا، خدا کی مرضی کے مطابق ہوگا؟"

سرسید نے ان معترضین کو جو آیاتِ جہاد کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ انسانیت کے خون بہانے اور بنی نوع انسان کے خون سے ہاتھ رنگنے کی ترغیب دیتی ہیں، یہ جواب دیا ہے کہ لڑائی شروع ہونے کے بعد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے کہ دشمنوں کو قتل کرو، لڑائی میں بہادری دکھاؤ، دل کو مضبوط رکھو اور میدان میں ثابت قدم رہو۔ قرآن میں جتنی بھی آیات جہاد کے متعلق ہیں ان کا یہی مفہوم ہے۔ ان سے بے جا خونریزی مراد لینا سراسر زیادتی ہے کیونکہ اسلام نے خود بارہا رحم کی ترغیب دی ہے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو جو شریک جنگ نہ ہوں قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ مغلوب کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ صلح و امن کی پیش کش کو قبول کرنا ضروری بتلایا ہے حتیٰ کہ باغوں کو کاٹنے اور کھیتوں کو جلا کر تباہ کر دینے کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔

غلامی

سرسید سے پہلے اکثر مفکرین غلامی کے جواز پر متفق تھے۔ ان کا خیال صرف یہ تھا کہ معاشرہ کے اس مظلوم طبقہ کے ساتھ نرمی اور رحمدلی کا سلوک ہونا چاہیئے۔ لیکن سید صاحب غلامی کے عدم جواز کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور ان کو اس ستم ظریفی سے بڑا دکھ پہنچا ہے کہ "جن مذاہب میں کوئی خاص رعایت غلاموں کے ساتھ نہیں کی گئی وہ تو تمام دنیا میں غلامی اور بردہ فروشی کا انسداد کرتی پھرتی ہیں اور مسلمان جن کے مذہب نے تمام دنیا کے مذاہب سے بڑھ کر غلاموں کی حمایت کی اور سچ پوچھئے تو غلامی کو گویا بالکل معدوم کر دیا وہی تمام دنیا میں بردہ فروشی کے ناجائز اور ناشائستہ رواج میں سب سے زیادہ بدنام ہیں اور انہیں کے مذہب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کا دشمن اور ظلم و بے رحمی کا سرچشمہ ہے۔"

سرسید ابطالِ غلامی میں عقلی اور نقلی دونوں قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ عقلی دلائل میں ایک دلیل یہ دی ہے کہ اگر غلامی خدا کی مرضی کے مطابق ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا بندوں کو اپنا شریک گردانا پسند کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"آزادی اور غلامی آپس میں ایسی نقیض ہیں کہ نہ تو دونوں کا اجتماع ہو سکتا ہے اور نہ دونوں کا ارتفاع۔ اس لیے یہ دونوں داخل مرضیٔ پروردگار نہیں ہو سکتیں۔ ورنہ خود پروردگار کی مرضی میں تناقض لازم آئے گا۔" اس کے علاوہ سرسید ایک اور دلیل دیتے ہیں "ہم دیکھتے ہیں کہ انسان ایک ایسی ہستی بنایا گیا ہے جس کی فطرت میں آزادی اور خود مختاری رکھی گئی ہے۔ وہ ذی عقل اور ذی شعور ہے اس کو تمام قوائے ظاہری و باطنی دیئے گئے ہیں۔ ان کے استعمال پر جس طرح وہ چاہے قادر ہے ..... پس یہ تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس پتلے کے صانع کی مرضی یہی تھی کہ پتلا خود اپنا مالک رہے۔"

غلامی کے متعلق مذاہب کے رویے پر سرسید کا تبصرہ یہ ہے "یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اس کی نسبت کہا اس کو کسی نے نہیں سمجھا ان کا دعویٰ ہے کہ غلامی کی رسم جو نزولِ قرآن کے وقت عرب میں تمام دنیا کی قوموں کی طرح جاری تھی دفعتہً موقوف کر دینا صرف ملکی مصالح کے خلاف نہ تھا بلکہ ایسا کرنا انواع اور اقسام کے گناہوں کا باعث بنتا۔ اسی لیے اسلام نے شراب خوری کی طرح غلامی کو بتدریج موقوف کرنے کی بنیاد ڈالی۔ ترغیب کے علاوہ بہت سے موقعوں پر حکماً غلاموں کو آزاد کرنے کے راستے کھول دیئے ہیں۔ سید صاحب پہلے شخص ہیں جو اس بات کے دعویدار ہیں کہ لڑائی میں قیدیوں کو غلام بنانے کا حکم قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیثِ صحیح سے ثابت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک آیت فامامنا بعد واما فداء نازل نہیں ہوئی تھی اس وقت تک قدیم دستور کے مطابق لونڈی اور غلام بنائے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں جابجا غلاموں کے متعلق احکامات موجود ہیں۔ اس آیت کے نزول کے بعد مستقبل میں غلام بنانے کی ممانعت کر دی گئی لیکن پہلے کے غلاموں کو آزاد کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ سرسید اپنے اس دعویٰ میں منفرد ہیں کہ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے۔ پہلے یہ قیدی یا تو قتل کر دیئے جاتے تھے یا انہیں غلام بنا لیا جاتا تھا یا فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ کے احساناً چھوڑ دیا جاتا تھا۔ محولہ بالا آیت کے نازل ہونے کے بعد قتل اور غلامی ممنوع قرار دیئے گئے اور صرف رہا کرنے کا حکم باقی رہا خواہ فدیہ لے کر ہو یا محض احسان اور نیکی کے خیال سے بغیر کچھ لئے دیئے چھوڑ دیا جائے۔

آزادی

سرسید اگرچہ غلامی کو فی نفسہٖ ایک قدرتی گناہ سمجھتے ہیں کیونکہ انسان فطرۃً آزاد اور مختار پیدا ہوا ہے لیکن وہ شخصی آزادی اور اجتماعی آزادی میں فرق کرتے ہیں اور وہ موخر الذکر کو اول الذکر پر کسی صورت میں قربان کر دینے کے لیے آمادہ نظر نہیں آتے۔ کونسل میں انہوں نے چیچک کے جبری ٹیکے کا مسودۂ قانون پیش کرتے ہوئے کہا "شخصی آزادی کی رعایت اس مضرت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چیچک کے متعدی ہونے سے اوروں کو پہنچتی ہے۔"

حقوقِ نسواں

سرسید کے ہاں عورت کو بھی مرد کے برابر حقوق حاصل ہیں۔ ان کے تمام پیشرو مفکرین کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ عورتوں

کو سیاست میں دخل دینے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ حتیٰ کہ نظام الملک کے نزدیک عورت ضعیف العقل ہونے کے باعث سیاست میں دخل پانے کی مستحق نہیں ہے۔ اور ابن طقطقی تو ان سے امور سلطنت میں مشورہ لیے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا بشرطیکہ ان کے دیئے ہوئے مشوروں کے خلاف عمل کیا جائے۔ سرسید نے عورتوں کے بارے میں انگلینڈ کے مروجہ قوانین سے بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ ان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود درحقیقت وہ عورتوں کو حقیر و لایعقل سمجھتے ہیں۔ عورت کسی قسم کا معاہدہ نہیں کر سکتی، شوہر کی مرضی کے خلاف اس نے جن دستاویزات پر اپنے دستخط ثبت کیے ہوں قانون کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ قانوناً عورت نہ تو کسی پر دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اس پر کوئی دعویٰ رجوع کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ شوہر کی اجازت کے بغیر بیع و شرا اور دیگر لین دین کی مجاز نہیں۔ سرسید کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو مرد کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ سن بلوغ کے بعد وہ اپنے نکاح میں خود مختار ہے یعنی جس طرح کہ مرد ہے۔ وہ مردوں کی طرح اپنی ذاتی جائداد کی مالک ہے۔ معاہدہ، خرید و فروخت، ہبہ، وصیت اور وقف کرنے کے اس کو کلی اختیارات حاصل ہیں۔

سیاست میں عورت کا کتنا حصہ ہے۔ سرسید اس کے متعلق کوئی واضح بات تو نہیں کہتے۔ تاہم جب وہ یہ کہتے ہیں کہ عورت پر دو ہی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ اول ایسی پابندی جو عورت نے خود بسبب معاہدۂ نکاح اپنے اوپر عائد کر لی ہو اور دوسری ستر عورت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید عورتوں کو کاروبار مملکت میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہونے میں کوئی ہرج نہیں دیکھتے۔

حکومت اور تعلیم

آخر میں سرسید کے نظریۂ تعلیم و سیاست سے بحث ضروری ہے۔ انہوں نے تعلیم کی جو اہمیت بیان کی ہے اور اس سلسلے میں جو انہوں نے زریں کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ سرسید تعلیم کی آزادی پر ایمان رکھتے تھے۔ وفات سے چار سال قبل جالندھر کے مقام پر اہل پنجاب کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا "یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ اس کے ہاتھ میں بکے ہوئے ہیں جو ٹکڑا ٹیبر اعلم کا وہ دیتی ہے اسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو! ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہو گی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔ غلامی سے آزادی ہو گی۔ ہم آپ تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہو گا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج سر پر، یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف نجر بناتی ہے۔" ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے سرسید نے کہا "جب تک لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہو گا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام تر اہتمام لوگوں پر

چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔"

حکومت پر تعلیمی اداروں کے قیام کی حوصلہ افزائی البتہ فرض ہے۔ بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دیکھے حکام ضلع اس قسم کے اداروں کے قیام کی کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور اپنی حکومت اور رعب و داب کو ان کے خلاف عمل میں نہ لائیں۔ سرسید کے نزدیک مستحق طلبا کو حکومت کی طرف سے اسکالرشپ دیا جانا بھی مستحسن ہے۔ غرضیکہ تعلیمی معاملات میں اندرونی مداخلت کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں لیکن مالی امداد طلبا اور اداروں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تعلیم کو حکومت کی گرفت سے آزاد ہونا چاہیئے مدایک صدی کے تجربات نے ہم پر سرسید کے اس نظریہ کی صحت کو ثابت کر دیا ہے اور تعلیمی معاملات میں حکومت کی مداخلت کے نقصانات روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکے ہیں۔

سرسید کے مذہبی افکار (انگریزی)

مصنفہ بشیر احمد ڈار

سرسید احمد خاں ایک ترقی پسند اور روشن خیال تحریک کے علمبردار تھے اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے اسلامی تعلیمات کی جو تشریح و توضیح کی اس کو اس کتاب میں بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ قیمت دس روپے۔

افکارِ ابن خلدون

مصنفہ محمد حنیف ندوی

عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ کے امام اول ابن خلدون کے تنقیدی، عمرانی اور دینی و علمی خیالات و افکار کا ایک تجزیہ

صفحات ۲۳۲ - قیمت ۴ روپے چار آنے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور